دکن ہی میں لکھی گئیں۔ ان میں سے اکثر مثنویوں میں سادگی ہے اور انداز بیان فطری۔

مختصر یہ کہ دکنی مثنویاں اردو شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

شمالی ہند میں

شمالی ہند کے شاعر جب فارسی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی طرف بھی متوجہ ہوئے تو انھوں نے مثنویاں بھی لکھیں۔ ان شاعروں میں ایک اہم نام شاہ مبارک آبرو کا بھی ہے۔ ان کی مثنوی کا نام "موعظِ آرایش معشوق" ہے۔ اس کے بعد دوسرا اہم نام سید حیدر بخش حیدری کا ہے۔ انھوں نے ایک مختصر سا شاہنامہ اردو زبان میں لکھا اور نظامی کی مثنوی ہفت پیکر کا ترجمہ کیا۔

شمالی ہند میں اردو مثنوی کے آغاز کا ذکر ہو اور میر تقی میر کو نظر انداز کر دیا جائے یہ ممکن ہی نہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے میر کو اردو مثنوی کا موجد کہا ہے۔ یہ بات اس لیے درست نہیں کہ دکن میں میر سے بہت پہلے بلند پایہ مثنویاں لکھی گئیں۔ لیکن یہ کہنا بجا ہے کہ شمالی ہند میں مثنوی کے کامیاب نمونے میر سے پہلے کوئی پیش نہیں کر سکا۔

میر کی مثنویوں میں قصہ پن کی کمی کھٹکتی ہے۔ قصہ اسی وقت ابھر کر سامنے آتا ہے جب اس کی ساری تفصیل بیان کی جائے، تمام جزئیات پیش کی جائیں، قصے کے پس منظر کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ مثلاً کسی شادی کا بیان کیا جائے تو اس کی ساری رسمیں دکھائی جائیں اور تقریب کا پورا نقشا کھینچ دیا جائے۔ میر کی مثنویوں کے پلاٹ بھی ڈھیلے ڈھالے ہیں اور کردار نگاری بھی کمزور ہے۔ لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ میر شمالی ہندوستان میں مثنوی نگاری کا آغاز کر رہے تھے۔ ان کے سامنے اعلا درجے کی مثنوی کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔

میر سیدھے سادے عشقیہ قصوں کو نون مرچ لگائے بغیر بیان کر دیتے ہیں مگر اصلیت یہ ہے کہ نون مرچ لگانے سے ہی ایک اچھا قصہ وجود میں آتا ہے۔ میر کا سب سے بڑا کمال ان کا سادہ، سہل اور غیر پیچیدہ اندازِ بیان ہے اور یہ اندازِ بیان مثنوی کے لیے نہایت مناسب ہے کیونکہ لفظوں میں الجھے اور اِدھر اُدھر بھٹکے بغیر قاری کی توجہ قصے پر جمی رہتی ہے اور اسے آگے پیش آنے والے واقعات کا انتظار رہتا ہے۔

میر نے چھوٹی چھوٹی کئی مثنویاں لکھیں۔ ایک مثنوی میں انھوں نے اپنے گھر کی خستہ حالی کا

نقشا کھینچا ہے لیکن ان کی جس مثنوی نے بہت شہرت پائی اور قبولِ عام حاصل کیا وہ مثنوی دریائے عشق ہے۔ یہ ایک سادہ سا عشقیہ قصہ ہے۔ ایک عاشق اپنی محبوبہ کی جوتی نکالنے کے لیے دریا میں غوطہ لگاتا ہے اور ڈوب جاتا ہے۔ کچھ دنوں بعد اسی جگہ اس کی محبوبہ نے بھی ڈوب کر جان دے دی۔ اس مثنوی میں اور میر کی باقی مثنویوں میں بھی فوقِ فطری عناصر سے گریز کیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے بے جا مبالغے سے بھی دامن بچایا ہے اور مثنوی کو عریانی سے بھی محفوظ رکھا ہے۔ انھوں نے سچے عشقیہ جذبات کو پاکیزہ زبان میں پیش کر کے شمالی ہندوستان میں اردو مثنوی کی راہ ہموار کی۔

میر اثر میر تقی میر کے ہم عصر اور خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ اثر کی شاعری ان کے بڑے بھائی کے زیر اثر پروان چڑھی۔ ایک دیوان غزلیات بھی ان سے یادگار ہے لیکن جس تصنیف کے سبب ان کا نام آج تک زندہ ہے وہ ان کی مثنوی خواب و خیال ہے۔ اہلِ نظر نے اس مثنوی کو بہت سراہا ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے اسے سحر البیان کے بعد بے مثال قرار دیا ہے۔ کئی شاعروں نے میر اثر کی تقلید میں خواب و خیال جیسی مثنوی لکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔

مثنوی خواب و خیال کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی مسلسل قصہ نہیں پیش کیا گیا بلکہ اس میں اخلاق اور اہم واقعات کے زیرِ عنوان پچاس موضوعات پیش کیے گئے ہیں۔ مثنوی کی زبان بے حد صاف، شستہ اور رواں ہے۔ عام محاورات کے برمحل استعمال نے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا ہے۔ مثنوی میں عشقیہ مضامین بھی شامل ہیں اور خوب ہیں۔ معاملاتِ عشق میں بعض جگہ شاعر نے بے باکی سے کام لیتے ہوئے ایسے مضامین نظم کر دیے ہیں جن کی ایک صوفی شاعر سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

کئی سو اشعار پر مشتمل ایک سراپا بھی خواب و خیال میں شامل ہے۔ اس مثنوی کے وجود میں آنے کا ایک سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ خواجہ میر درد نے ایک بار تقریباً مثنوی کے سو شعر کہہ ڈالے۔ اثر نے ان سے یہ شعر لے لیے اور ان کی بنیاد پر یہ مثنوی کہہ ڈالی۔

میر اور اثر کے علاوہ اس دور کے ایک اہم شاعر محمد رفیع سودا ہیں۔ مثنویاں انھوں نے بھی لکھیں مگر اس پلے کی کوئی مثنوی نہ لکھ سکے مثنوی کی تاریخ میں جس کا ذکر ضروری ہو۔ میر کی طرح ان کے یہاں بھی بے حد اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ قصہ پن کی کمی ہے۔ کردار نگاری ناقص ہے۔ جزئیات نگاری کو نظر انداز

Scanned by TapScanner

کیا گیا ہے۔ محاکات کے بجائے تخیل کی آمیزش زیادہ ہے۔ فن کی کسوٹی پر سودا کی مثنویاں پوری نہیں اترتیں۔ میر اور سودا کے بعد شاعری کا مرکز لکھنؤ کو منتقل ہو گیا کیونکہ دہلی اجڑ گئی تھی اور شاعروں کا یہاں رہنا دشوار ہو گیا تھا۔

اس مرکز کے قدیم شعرا میں جس مثنوی نگار کا کارنامہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے وہ میر حسن ہیں۔ ان کی مثنوی سحر البیان واقعی سحر مجسم ہے۔ اس مثنوی نے قصہ بے نظیر و بدر منیر کے نام سے بھی شہرت پائی کیونکہ یہ مثنوی ان دونوں کی محبت کی داستان ہے جو اس مثنوی کے ذریعے اردو ادب میں امر ہو گئی۔ میر حسن نے مثنوی نگاری کے فن میں بے مثال مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا اصل کمال یہ ہے کہ مثنوی میں جتنے کردار اور جتنے مناظر ہیں سب میں حقیقت کا رنگ غالب ہے۔ ہر کردار انفرادی خصوصیات کا مالک اور دوسرے کرداروں سے مختلف ہے۔ مثنوی کا ہر منظر حقیقی نظر آتا ہے۔

مولانا حالی میر حسن کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: میر حسن نے قصہ نگاری کے تمام فرائض پورے ادا کیے ہیں۔ سلطنت کی شان و شوکت، تخت گاہ کی رونق اور چہل پہل، لاولدی کی حالت، یاس و ناامیدی اور دنیا سے دل برداشتگی، جوتشیوں کی گفتگو، شہزادے کی ولادت اور چھٹی کی تقریب، ناچ رنگ اور گانے بجانے کے ٹھاٹھ، باغوں اور محلوں کے نقشے، سواریوں کا جلوس، مکانوں کی آرائش، شاہانہ لباس اور زیورات ـــ غرض کہ جو کچھ اس مثنوی میں بیان کیا ہے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ کر رکھ دی ہے۔

مثنوی سحر البیان اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ یہ اپنے عہد کے رہن سہن اور رسم و رواج کا آئینہ ہے۔ اس کے مطالعے سے میر حسن کے زمانے کی پوری زندگی کی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے لیکن مثنوی کی سب سے اہم خصوصیت اس کا اندازِ بیان ہے۔ شاعر نے سہل اور عام فہم زبان استعمال کی ہے اور لفظوں کو شعروں میں نگینوں کی طرح جڑا ہے۔ یہ مثنوی لکھنؤ میں لکھی گئی لیکن اس کے مصنف کو دہلوی ہونے پر فخر تھا۔ اس لیے ان کے یہاں لکھنؤ کے بجائے دہلی کا اندازِ بیان ہی نظر آتا ہے۔ تشبیہ و استعارے کے انداز میں بھی یہی رنگ ہر جگہ جھلکتا ہے۔ تشبیہ کے لیے وہ ایسی چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں جو سامنے کی ہوں اور ان کی تہوں کو کھولنے کے لیے قاری کے ذہن کو قلابازیاں نہ کھانی پڑیں۔ مختصر یہ کہ شمالی ہند کی مثنویوں میں میر حسن کی سحر البیان کو ایک قابلِ رشک مقام حاصل ہے۔

غلام ہمدانی مصحفی نے بھی متعدد مثنویاں لکھیں ان میں بحر المحبت سب سے اہم ہے۔ یہ مثنوی میر کی دریائے عشق کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ قصہ بھی کم و بیش وہی ہے۔ غالباً مصحفی کی خواہش یہ تھی کہ میر کی مثنوی کے مضمون کو وہ جدید دلکش زبان میں پیش کر کے مثنوی سحر البیان کے ہم پلہ ایک اعلا درجے کی مثنوی پیش کر سکیں۔ مگر وہ ناکام رہے۔ دونوں مثنویوں کا مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے فطری زبان کے بجائے مصنوعی زبان میں ایک مثنوی پیش کر دی۔ اگر وہ میر کی پیروی کے بجائے کوئی طبع زاد مثنوی لکھتے تو ممکن تھا کامیاب رہتے۔ لیکن وہ میر سے آگے تو کیا نکلتے مثنوی نگاری میں میر تک بھی نہیں پہنچ سکے۔

مصحفی کے سب سے نامور شاگرد خواجہ حیدر علی آتش اور ان کے شاگرد دیا شنکر نسیم تھے۔ انھوں نے اپنے استاد کی رہنمائی میں ایک ایسی مثنوی لکھی جسے لکھنؤ کی نمائندہ شاعری کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اختصار اور صناعی اس مثنوی کی اہم خصوصیات ہیں۔ مثنوی میں بے شک تصنع کا انداز پیدا ہو گیا لیکن ایک ایسی مثنوی وجود میں آگئی جو حسن کاری اور صنعت گری کی لافانی مثال ہے۔

گلزارِ نسیم کے بعد لکھنؤ کے بہت سے شاعروں نے اس کی تقلید میں مثنویاں لکھیں لیکن گلزارِ نسیم کے رتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکا۔ آفتاب الدولہ قلق کی مثنوی طلسمِ الفت مقبول ضرور ہوئی لیکن اسے گلزارِ نسیم کے مقابلے پر نہیں رکھا جا سکتا۔

لکھنؤ کے آخری اہم مثنوی نگار نواب مرزا شوق ہیں۔ ان کی مثنویوں میں زہرِ عشق نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ یہ ایک پُر اثر حزنیہ مثنوی ہے۔ مثنوی کی زبان، مکالمے، حزنیہ ماحول ـــ ان سب چیزوں نے مل کر اس کی تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔ کسی زمانے میں اس کے اشعار دل والوں کی زبانوں پر جاری تھے۔ کچھ بزرگوں کو آج بھی اس کے اشعار یاد ہیں۔

منیر شکوہ آبادی کی مثنوی معراج المضامین ایک مذہبی مثنوی ہے۔ اس لیے اس کا دائرہ اثر محدود رہا۔ علاوہ ازیں زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اس کا پایہ بہت بلند نہیں۔

اس کے بعد شعر و ادب کا مرکز پھر دہلی کو منتقل ہو گیا اور یہاں ذوق، مومن اور غالب جیسے باکمال شاعر پیدا ہوئے لیکن ان کی توجہ غزل پر مرکوز رہی۔ غالب نے صرف ایک مثنوی ابر کم کی تعریف میں (در صفت ابر) لکھی مگر یہ نہایت غیر اہم ہے۔ مومن نے چند اچھی مثنویاں لکھیں ان میں مثنوی

Scanned by TapScanner

قول عمیں قابلِ ذکر ہے۔ داغ، امیر، محسن کی مثنویاں بھی دلکش ہیں۔

ہندوستان پر انگریزی تسلط قائم ہونے کے بعد یہ خیال عام ہوا کہ شاعری کو مفید اور کارآمد ہونا چاہیے۔ سرسید اور حالی نے مثنوی کی اہمیت کا احساس دلایا۔ حالی نے سادہ زبان میں خود کئی مثنویاں لکھیں ان میں برکھارت اور چپ کی داد اہم ہیں۔ سرسید کے زیر اثر مولانا محمد حسین آزاد نے بھی کئی مثنویاں لکھیں اور سرسید کے مشورے پر نیچرل شاعری کی طرف توجہ کی۔ اس زمانے کے مثنوی نگاروں میں اسماعیل میرٹھی اور شوق قدوائی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اقبال اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے فلسفیانہ افکار کی اشاعت کے لیے مثنوی سے بھی بہت کام لیا۔ ان کی مثنویوں میں 'سید کی لوحِ تربت'، 'انسان اور بزمِ قدرت'، 'رخصت اے بزمِ جہاں' قابلِ ذکر ہیں لیکن 'ساقی نامہ' ان سب کے مقابلے میں نہایت اعلا درجے کی مثنوی ہے۔

جوش نے کئی عمدہ مثنویاں لکھیں۔ ان میں جنگل کی شہزادی، جمنا کنارے، بیوہ سہاگن نہایت درجہ دلکش و پُر تاثیر ہیں۔ حفیظ جالندھری کی مثنوی 'شاہنامۂ اسلام' ہمارے عہد کی طویل ترین مثنوی ہے جس نے بہت شہرت پائی۔

مختصر یہ کہ شمالی ہندوستان نے مثنوی نگاری کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں اور بہت بلند پایہ نہ سہی لیکن بہت سی دلکش و پُر تاثیر مثنویاں پیش کیں۔ ❋ ❋